تدوینِ فقہ

(۴)

حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبۂ دینیات
جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

اور تلاش و جستجو کا یہ فطری تقاضا کم و بیش سب ہی میں موجزن تھا، لیکن مقربین بارگاہِ نبوت جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج شناس ہونے کے ساتھ ساتھ رسالت و نبوت کے جلال و ہیبت سے بھی مرعوب تھے۔ جو جتنا قریب تھا اسی قدر جلالِ نبوی سے اس کا قلب متاثر تھا، دنیا تو دنیا، دین کی باتوں میں بھی باوجود شدید ضرورت کے ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما جیسے مقربوں کو بھی جسارت نہیں ہوتی تھی، مشہور واقعہ ہے کہ نماز میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سہو کی صورت پیش آئی، سلام پھیر کر مصلی سے آپ باہر بھی ہو چکے تھے، صحابہ حیران تھے کہ قصہ کیا ہے، اشاروں اشاروں میں ایک دوسرے سے کچھ کہہ رہا تھا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھنے کی ہمت کسی کو نہیں ہوتی تھی، راوی نے صراحتہً بیان کیا ہے کہ ابوبکر و عمر بھی موجود تھے لیکن

فھابا ان یتکلماہ (صحاح) پس دونوں بولنے سے ڈر رہے تھے۔

بالآخر ایک خاص طرز کے صحابی جن کو بطور ظرافت کے بارگاہِ نبوت سے ذوالیدین (دو ہاتھوں والے) کا خطاب اس لئے ملا تھا کہ ان کے ہاتھ معمول سے کچھ زیادہ لمبے تھے پیغمبر کے وہی ذوالیدین آگے بڑھے، پوچھنے کی ہمت کرتے ہیں لیکن کتنی ہمت، ان کے سوال

اقصرت الصلوۃ ام نسیت یا رسول اللہ نماز (کی رکعتیں) کم کر دی گئی ہیں یا اے اللہ کے رسول آپ کچھ بھول گئے

سے اندازہ ہوسکتا ہے، یعنی براہِ راست سہو کے انتساب کی جرأت ذوالیدین کو بھی نہ ہوسکی۔ حالانکہ ان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ کبھی کبھی مذاق بھی فرمالیا کرتے تھے۔ اس کرم نے انھیں کچھ شوخ بھی بنادیا تھا، دربارِ نبوت میں بہ نسبت دوسروں کے وہ کچھ زیادہ جری تھے حلقۂ نبوی کا جو نقشہ

کان علیٰ رؤسھم الطیر گویا ان کے سروں پر پرند بیٹھے ہیں۔

کے الفاظ میں کھینچنے والوں نے کھینچا ہے وہ اسی جلالِ الٰہی کی طرف اشارہ ہے، یہی وجہ ہے کہ جیسا کہ صحاح کی حدیثوں میں آتا ہے کہ مقربینِ سرا پردۂ رسالت ہمیشہ اس آرزو میں رہتے کہ ہم سے تو ڈر کے مارے کچھ پوچھا نہیں جاتا، کاش! کوئی دیہاتی اعرابی آجاتا جو اپنی بداوت کی وجہ سے ممکن ہے ایسے سوالات کرگذرے جن کے جواب میں ہم لوگوں کو کوئی جدید علم ہاتھ آئے، جب کبھی مجلس نبوی میں اس قسم کے کوئی صاحب آجاتے تھے اور اپنے عجیب وغریب سوال کا سلسلہ شروع کرتے تو صحابہ میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی تھی اور ہر ایک ہمہ تن گوش بن کر جوابوں کے ان موتیوں کو چنتا تھا۔

پھر جوں جوں فتوحات کا سلسلہ وسیع ہوا، اور وفود کا تانتا بندھا، نت نئے انداز کے مختلف طبائع اور مزاج کے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آنے لگے، اور موقعہ کو غنیمت جان کر جس کو موقع ملتا تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھتا تھا۔ ان سوالات میں زیادہ تر تو ایسے ہی سوالات ہوتے تھے، جن کا دین سے تعلق ہوتا تھا۔ پھر بعض دفعہ تو ان سوالات کے جواب میں وحی نازل ہوتی، قرآن مجید میں تیرہ مقامات میں یسئلونک کے لفظ سے جن امور کا ذکر ہے حضرت ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ یہ ان ہی سوالات کے جوابات تھے جو صحابہ نے مختلف اوقات میں آپ سے دریافت کئے۔

لیکن اسی کے ساتھ سوالات کا ایک مستقل سلسلہ وہ بھی شروع ہوا، خصوصاً اجنبی نووارد لوگوں کی طرف سے جن کا تعلق دین سے نہ ہوتا تھا، انتہا یہ ہے کہ بعضوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم

آکر پوچھا کہ سبا کا لفظ آیا کسی سرزمین کا نام ہے یا کوئی عورت اس نام کی تھی، ایک صاحب نے آکر دریافت کیا کہ بچے کبھی باپ، کبھی ماں کے ساتھ کیوں مشابہ ہوتے ہیں، ظاہر ہے کہ ان باتوں کا دین سے کیا تعلق ہے، لیکن بعض سادہ دل جو مذاق شناس نبوت نہ تھے، اس قسم کے سوالات بھی کر لیا کرتے تھے، گویا اس کی مثال وہی ہوئی جیسے کفار قریش نے ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے بجائے نبوت کے انجنیری کا کام لینا چاہا تھا۔ جس کا ذکر قرآن میں بھی ہے، یعنی یہ مطالبہ پیش کیا کہ ہمارے ملک میں جو پہاڑ بھرے ہوئے ہیں ان کو صاف کردو، اور ہمارے ریگستانوں میں نہریں جاری کردو، وغیرہ، قرآن میں حق تعالیٰ نے اس کے جواب میں پیغمبر کو حکم دیا کہ ان بے وقوف پوچھنے والوں سے کہدو کہ

سبحان ربك هل كنت — پاک ہے تیرا رب (اس قسم کی بے نظمیوں سے) نہیں ہوں

الا بشرا رسولا۔ — میں لیکن ایک آدمی پیغمبر۔

یعنی میں خدا نہیں بشر ہوں، اور انجنیر نہیں رسول ہوں، پیغمبر سے اس قسم کا مطالبہ گویا عالم کے موجودہ نظم کے بدلنے کا مطالبہ ہے، حالانکہ وہ تو اسی نظم کے اندر انسانوں کو کامیاب زندگی بسر کرنے کا طریقہ سکھانے کے لئے آتا ہے۔

اسی طرح بعض لوگ ایسے سوالات بھی کرتے تھے جن کا تعلق گو دین ہی سے ہوتا، لیکن اس کے نہ جاننے سے دین میں نہ اضافہ ہوتا تھا نہ کمی، اس سلسلہ میں ایک صاحب نے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے آکر یہ پوچھا کہ یا رسول اللہ جنت میں کپڑے بُنے جائیں گے یا اللہ میاں سلے سلائے بنے بنائے کپڑے وہاں پیدا کرینگے۔ سائل کے اس سوال کو سُن کر بیچارے صحابہ بھی ہنس پڑے، سائل کی خفت کو محسوس کرکے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تسلی کی اور ہنسنے والوں سے فرمایا کہ

تضحكون من جاهل — تم ایک نہ جاننے والے پر ہنستے ہو جو جاننے

يسأل عالما (کنز العمال) — والے سے پوچھ رہا ہے۔

پھر سائل کو مخاطب کرکے فرمایا کہ

تنشق عنها ثمار اہل الجنة — اہلِ جنت کو جو پھل ملیں گے ان ہی پھلوں سے پھٹ کر کپڑے باہر نکلیں گے۔ [1]

الغرض آخر زمانہ میں سوالات کا ایک لامحدود سلسلہ تھا جو نئے آنے والوں کی طرف سے خدمتِ مبارک میں پیش ہوتا رہتا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طبعی نرم دلی اور مروت نہیں چاہتی تھی کہ لوگوں کو مایوس کیا جائے اور جیسا کہ آپ کا قاعدہ تھا، انتہائی ملائمت اور مسامحت کے ساتھ پوچھنے والوں کی تسلی فرما دیتے تھے۔

لیکن ایک طرف بعض سادہ مزاج بزرگوں کے عجیب وغریب سوالات اور دوسری طرف مدینہ منورہ میں آستین کے جو سانپ یہودیوں اور غیر یہودیوں کے طبقات سے منافقانہ طور پر مسلمانوں میں گھل مل گئے تھے ان کی قصداً شرارت بھی شریک ہوگئی۔ کبھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فطری نرم مزاجی کو دیکھکر کوئی بوڑھی عورت بھی اپنے کسی کام کے لئے کسی گلی میں روک لیتی ہے تو آپ رک جاتے ہیں، جو کچھ کہتی رہتی ہے سنتے ہیں۔ پانچویں کالم کے اس گروہ نے سرگوشی کے بہانہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ستانا شروع کیا، جس کے انسداد کے لئے بالآخر قرآن کو دخل دینا پڑا۔

دوسری طرف یہی بدبخت یہودی جن کے دین کی ہنڈیا پکنے کے بعد جل چکی تھی اور جیسا کہ ہمیشہ سوختہ اور برشتہ مذاہب کی آخری تاریخ کا خاتمہ چند لایعنی دور از کار بیہودہ سوالات و جوابات پر آکر منتہی ہوجاتا ہے۔ کسی کا مذہب صرف دسترخوان اور باورچی خانہ کے مسائل میں چکر کھا کر ڈوب جاتا ہے کسی کی ایک کو تین، تین کو ایک بنانے میں ساری مذہبی قوت خرچ

---

[1] اس دنیا میں بھی سینکڑوں نباتاتی چیزیں جو عجیب و غریب نظم کے ساتھ غیب سے ظاہر ہو رہی ہیں مثلاً مکا کے بھٹوں کو دیکھئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ باضابطہ تہ بتہ مضبوط غلافوں میں بند کرکے قدرت کی طرف سے کوئی پارسل آتا ہے اور اس کی مثالیں بکثرت ہیں ایک نمونہ ہے جس سے اس دنیا کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ ۱۲

ہوجاتی ہے، سنتے ہیں کہ بعض بعض ادیان میں آخری سوال وجواب یہ رہ گیا تھا کہ اللہ کے فرشتوں کی کتنی تعداد سوئی کے ناکے سے گزر سکتی ہے، ایک فرقہ کا تخمینہ دس ہزار تھا اور دوسرا بارہ ہزار کی تعداد پر مصر تھا۔ مدتوں دونوں فرقوں میں خوب رزم آرائیاں، کفش آزمائیاں ہوئیں۔ یہودی بھی اسی حال میں مبتلا تھے، اسی قسم کے دور از کار لاحاصل سوالات سکھا سکھا کر لوگوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجتے اور جواب پر اصرار کرتے، بخاری میں ہے کہ نوبت یہانتک پہنچی کہ جس کا اونٹ گم ہوجاتا وہ بھی

این ناقتی — میری اونٹنی کہاں ہے۔

کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فتویٰ پوچھتا، بعضوں کو اپنے باپ کے متعلق کچھ اشتباہ تھا تو وہ بھی اپنے نسب نامہ کی تصحیح کے لئے پیغمبر کے پاس آئے اور

من ابی — میرا باپ کون ہے

کا فتویٰ دریافت کیا۔ بالآخر اس مسئلہ کو بھی اپنے ہاتھ میں قرآن کو لینا پڑا۔ حق تعالیٰ نے سورۂ مائدہ کی یہ مشہور آیت نازل فرمائی

یاایھا الذین اٰمنوا لا تسئلوا	لوگو! ایسی باتیں نہ پوچھا کرو کہ تم پر جب وہ
عن اشیاء ان تبد لکم تسؤکم	ظاہر ہوں تو تمہیں برا معلوم ہو اور تم اگر اس وقت
وان تسئلوا عنھا حین ینزل	پوچھو گے جب قرآن اتر رہا ہے تو وہ ظاہر کی جائینگی
القرآن تبد لکم عفی اللہ عنھا	اللہ نے معاف فرمادیا، اور اللہ مغفرت فرمانیوالا
واللہ غفور رحیم۔	رحم کرنے والا ہے۔

تنبیہ کی گئی کہ اگر پیغمبر سے تم نے گم شدہ اونٹ کی تلاشی یا اپنے نسب نامہ کی تصحیح کا کام لیا، اور جب وہ خدا سے علم پا رہا ہے تو جو واقعہ ہوگا وہی جواب دیگا، ممکن ہے کہ جس باپ کی طرف ابھی منسوب ہو، یہ انتساب غلط ثابت ہو، اور اس کے بعد لگو گے پھر منہ بنانے کہ دیکھئے صاحب پیغمبر ہمیں گالیاں دیتے ہیں۔

بہرحال جب یہ آیت نازل ہوئی تو اس قسم کے دور از کار سوالات کا سلسلہ بند ہو گیا۔ کیونکہ اب بھی اگر کوئی خدا کے حکم کی خلاف ورزی کر کے ایسے سوالات کی جرأت کرتا تو یہ اس کے نفاق کا اعلان ہوتا تھا۔

عام مفسرین تو سورۂ مائدہ کی اس آیت کی شانِ نزول ہی بیان کرتے ہیں لیکن جہاں تک میں خیال کرتا ہوں، اس کے سوا بھی قرآن کے اس قانون کا ایک بڑا اہم راز تھا جس کا سراغ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے اقوال اور طرزِ عمل سے ملتا ہے، زیادہ تر اس بحث کے چھیڑنے کی یہاں ضرورت اسی مسئلہ کے بیان کرنے کے لئے ہوئی۔

بات یہ ہے کہ قرآن پڑھنے والوں پر یہ بات تو پوشیدہ نہیں ہے کہ اسلام نے انسانی زندگی کے جس جس شعبہ اور جن جن پہلوؤں کو اپنے دائرہ بحث میں درج کیا ہے، اس میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے جس کی اصل روح اور اس قانون کی جو اساسی بنیاد ہے اس کو عجیب و غریب جامع و مانع ساتھ ہی انتہائی لچکدار تعبیروں کے ساتھ قرآن میں بیان نہ کر دیا گیا ہو، مثلاً باہمی تجارتی لین دین کے قانون کا ذکر کرتے ہوئے۔

یا ایھا الذین اٰمنوا لا تاکلوا	لوگو! آپس میں ایک دوسرے کا مال
اموالکم بینکم بالباطل	باطل طریقہ سے نہ کھایا کرو، مگر یہ کہ
الا ان یکون تجارۃ عن	باہمی رضامندی کے ساتھ تجارت ہو
تراض منکم	

یا اسی کے ساتھ۔

لا تظلمون ولا تظلمون نہ تم کسی پر زیادتی کرو، اور نہ تم پر زیادتی کی جائے۔

یہ چند لفظی ایک دو فقرے قرآن میں پائے جاتے ہیں، لیکن صرف ان ہی چند لفظوں کی روشنی میں یہ مبالغہ نہیں کر رہا ہوں کہ فقہاءِ اسلام نے کم از کم پانچ چھ ہزار دفعات قانونِ تجارت کے پیدا کئے ہیں، جن کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں مل سکتی ہے اور تقریباً یہی طرزِ عمل قرآن نے

اپنے تمام متعلقہ مباحث کے متعلق اختیار کیا ہے[1]۔

جیسا کہ میں نے اپنے تمہیدی بیان میں بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے، اس خاص طریقۂ بیان کے اختیار کرنے کے جہاں اور بھی چند در چند وجوہ ہیں، دو اہم راز یہ ہیں کہ قرآن میں زندگی کے ہر شعبہ کے متعلقہ قوانین کے کلیات بلکہ کلیات سے بھی زیادہ بہتر طریقہ سے ہم اس چیز کو موجودہ محاورہ میں "روح" اور "سنس" کے لفظ میں ادا کر سکتے ہیں، بجائے اس کے جزئیات اور لامحدود جزئیات کے بیان کرنے کا اگر ارادہ کیا جاتا تو علم الٰہی کی لامحدود وسعت کے حساب سے واقعہ یہ ہے کہ ایک ایک قانون کی تفصیلات کے لئے بھی دنیا کا کاغذی مواد کافی نہیں ہو سکتا تھا، اور بالفرض اللہ میاں اپنی قدرت کاملہ سے اتنا کاغذ اور اتنی سیاہی بھی پیدا کر دیتے کہ ان کی قدرت غیر محدود ہے۔ لیکن ہم محدود قدرت والے انسانوں کے لئے اس کی حفاظت و نگرانی تعلیم و تعلم کا کام تو یقیناً ناممکن ہوتا۔ یہ بات کہ ہماری حفاظت و نگرانی کی قوت ہی کو لامحدود بنا دیا جاتا۔ بلاشبہ یہ تو ممکن ہے لیکن ہم میں وہ انسان نہیں باقی رہ سکتے تھے جو اب ہیں۔ اور میری گفتگو کا تعلق اس وقت ان ہی انسانوں سے ہے جو اپنے موجودہ حالات میں اس خاک دان ارضی پر پائے جاتے ہیں، جنوں اور دیوپری کی اولاد یا جبریل و میکائیل جیسے فرشتوں سے ہمیں بحث نہیں ہے۔

یہ تو پہلی بات ہوئی، دوسری بات یہ ہے جیسا کہ اشارۃً میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ اسلامی تعلیمات کے جو رجحانات ہیں ان میں ایک عام اور اہم رجحان ان کی سہولت اور ملتِ اسلامیہ محمدیہ کا "السمحاء" ہونا ہے یعنی نرمی اختیار کرنا، یہ اس کی خاص خصوصیت ہے

---

[1] خدا کے کلام اور خدا کے کام میں جو مشابہت ہے اس کی یہ بھی ایک مثال ہے مثلاً جسمانی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے ہمارے سامنے مٹی کا ایک تودہ بشکلِ زمین رکھدیا گیا ہے۔ بظاہر کون خیال کر سکتا تھا کہ خاک کے اسی تودہ میں انگوروں کے خوشے، آموں کی قاشیں، برفیوں اور امرتیوں کے ذخیرے، کوٹ شیروانی الغرض وہ سب کچھ پوشیدہ ہے جسے ہم کھا رہے ہیں، پہن رہے ہیں، برت رہے ہیں، مگر کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ اسی گیچڑ پانی سے یہ سب کچھ نکل رہا ہے۔ ۱۲۔

جس کی تصریح خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

بعثت بالملۃ السمحۃ میں ایک نرمی برتنے والی ملت کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہوں

کے الفاظ میں فرمائی ہے، قرآن میں بھی

ماجعل علیکم فی الدین من حرج نہیں رکھی ہے تم پر خدا نے دین میں تنگی۔

انما یرید اللہ بکم الیسر ولا خدا تو تمہارے ساتھ آسانی ہی چاہتا ہے اور

یرید بکم العسر۔ دشواری کو نہیں چاہتا۔

وغیرہ آیتوں کے سوا خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا تقریباً ہر موقعہ پر آسانی و سہولت کے پہلو کو اختیار کرنا، صحابہ کو عام طور پر وصیت کرنا کہ

بشروا ولا تنفروا، یسروا لوگوں کو خوشخبریاں سنایا کرنا، انھیں بھڑکانا مت

ولا تعسروا (بخاری وغیرہ) آسانی اور سہولت عطا کرنا۔ دشواری مت پیدا کرنا۔

اسلام میں بظاہر بعض قوانین کی شکل و صورت کا ذرا مہیب ہونا، لیکن معاً اسی کے ساتھ ایسے قیود کا اس میں اضافہ جن کی وجہ سے اس کی شدت کا خفت سے بدل جانا۔ مثلاً زنا کے جرم کی سزا کا قرآن میں سو تازیانے ہونا، اور شادی شدہ لوگوں کے لئے حدیثوں میں سنگسار کرنے کا قانون، صورۃً بہ ظاہر یہ قانون سخت معلوم ہوتا ہے، کبھی کبھی غیر اقوام کی طرف سے اس سختی کی شکایت بھی سنی جاتی ہے لیکن اسی کے ساتھ اگر وہ اس پر غور کرتے کہ ہر دعوے کے ثبوت کے لئے صرف دو گواہوں کو کافی قرار دیتے ہوئے جرم زنا کے ثبوت کے لئے خود قرآن میں چار گواہوں کا نصاب اور حدیثوں میں اس پر یہ اور اضافہ کہ گواہ بھی چشم دید رویت کے ہوں اور کیسی چشم دید گواہی کہ "کالمیل فی المکحلۃ" یا "کالرشاء فی البیر" یعنی سلائی سرمہ دانی میں یا ڈول کی رسی جس طرح کنوئیں میں ہوتی ہے، ایسی حالت میں ہر ایک گواہ کے گواہی دینے کے بعد مقدمہ ثابت ہوگا، اور گواہوں کو بھی اس کی دھمکی کہ بجائے چار کے اگر صرف تین آدمی زنا کی شہادت دینگے تو ان پر قذف یعنی انتساب زنا کے بدلہ میں مدعی مدعا علیہ

حد کا مطالبہ کرسکتا ہے، مطلب یہ ہے کہ گواہوں کے عام قانون جرح و تذکیہ کے سوا نصاب شہادت (یعنی چار گواہوں کی عینی رویت) کی عدم تکمیل کی صورت میں قذف کے جرم میں خود پٹ جانے کا گواہوں کو خطرہ، ان تمام امور کو اگر ملا لیا جائے تو شہادت کی روسے زنا کی اس خوفناک سزا کا نفاذ عملاً کچھ ناممکن ہی سا ہے۔ حتی کہ فقہا نے تو یہاں تک لکھدیا ہے کہ

لم ینقل عن السلف ثبوت	سلف (پچھلے علماء) سے یہ بات آج تک نہیں نقل
الزنا عند الامام بالشہادت	ہوئی ہے کہ امام (حکومت) کے سامنے گواہی کی
اذ رویۃ اربعۃ رجال عدول	راہ سے زنا کا مقدمہ کسی پر ثابت ہوا ہو، وجہ یہ ہے
علی الوصف المذکور ای	کہ چار صاحبِ عدل آدمیوں کا کسی کو اس حال
کالمیل فی المکحلۃ کما فی	میں دیکھنا جیسے سرمہ دانی میں سلائی ہو جیسے
الکلاب فی غایۃ الندرۃ۔	کتوں کو دیکھا جاتا ہے بہت ہی نادر الوقوع
(عنایہ علی الھدایہ مصری)	بات ہے۔

بہرحال شہادت کی راہ سے تو اس سزا کے ثبوت کا یہ حال ہے، رہا یہ کہ کوئی حکومت کے سامنے خود اپنے اس جرم کا اقرار کرلے تو اس باب میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ماعز اسلمی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کے متعلق جو سوہ اور نمونہ حدیثوں میں مروی ہے، اگر اس کو پیش نظر رکھا جائے یعنی گناہ کی اذیت کے احساس سے حضرت ماعز کی پاک فطرت بے چین ہو ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ان کو جرم کے اقرار پر مجبور کرتی ہے، وہ خود بڑھ بڑھ کر التجا کرتے ہیں کہ خدا کے ایک مجرم پر خدا کا قانون نافذ کیا جائے۔ لیکن سب جانتے ہیں کہ پیغمبر نے ایک بار نہیں، بار بار ان کے اقرار کی سماعت سے اعراض کرنا چاہا، حتی کہ جب انھوں نے سننے پر مجبور ہی کردیا تو آپ نے لوگوں کو حکم دیا کہ ان کا منہ سونگھیں۔ شراب پی کر نشہ میں تو نہیں کہہ رہے ہیں۔

محدثین کا بیان ہے کہ مقصد یہ تھا کہ وہ اپنے بیان کو نشہ پر اگر محمول کردیں تو جرم زنا کی کڑی سزا سے بچ کر صرف شراب خواری کی ہلکی سزا پر بات ٹل جائے گی، لیکن آخرت کے عذاب کو جو دنیا کے عذاب سے زیادہ سخت یقین کر چکے تھے ان حضرت ماعز رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی جانِ عزیز کو اپنے مالک کے قانون کے سپرد فرمادیا، اسی لئے حدیثوں میں آیا ہے کہ ان کی توبہ نے وہ وزن حاصل کیا، جس کا مقابلہ آسمان زمین کا وزن بھی نہیں کرسکتا ہے ظاہر ہے کہ فطرتِ انسانی میں احساسِ گناہ کے متعلق اتنی نزاکت وذکاوت پیدا ہوجانا نبوت ہی کا گویا معجزہ قرار پاسکتا ہے، عام حالات میں اس کا وقوع بھی آسان نہیں ہے۔

بہرحال میری غرض اس واقعہ کے بیان کرنے سے اس مقصد کی تائید ہے جو اسلام کے تیسیری نقطہ نظر میں عموماً پایا جاتا ہے، یعنی حتی الوسع یہ چاہا جاتا ہے کہ جہانتک ممکن ہو دینی زندگی گذارنے میں کسی قسم کی دشواری نہ ہو، عوام پر سختی نہ ہوجائے، یہی تراویح کی نماز ہے، اہلِ علم میں اس واقعہ سے کون ناواقف ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چند راتوں کے بعد یہ فرماتے ہوئے کہ

خشیت ان یکتب علیکم	مجھے اندیشہ ہے اس بات کا کہ یہ نماز تم پر فرض ہوجائے
ولوکتب علیکم ما قمتم بہ	اور اگر فرض ہوجاتی تو پھر تم اس نماز کے ساتھ کھڑے
(بخاری ومسلم وغیرہ)	کھڑے نہ ہوتے (یعنی اس کی عہدہ برآ نہیں ہوسکتے)۔

خود جماعت کے ساتھ اس نماز کا پڑھنا ترک فرمادیا، ظاہر ہے کہ مقصد مبارک یہی ہوسکتا ہے کہ اگر میں جماعت کے ساتھ ہر سال اس نماز کو پڑھتا رہا تو آئندہ چل کر میری مداومت کی وجہ سے اس کا اندیشہ ہے کہ مسلمانوں پر یہ نماز بھی وجوب اور فرضیت کی شکل اختیار نہ کرلے تاکہ آئندہ گرفت اور مطالبہ میں سختی نہ کی جائے۔ اسی لئے آپ نے اس نماز کو جماعت کے ساتھ پڑھنا ترک فرمادیا اور صحابہ کو بھی اس کے پڑھنے سے اپنے زمانے میں جماعت کے ساتھ منع فرمادیا۔[1]

[1] بخاری ومسلم میں ہے کہ مندرجہ بالا الفاظ ارشاد فرمانے کے بعد صحابہ کرام سے (باقی حاشیہ ص پر ملاحظہ ہو)

یقیناً اس سے بھی اسی اصول کی طرف رہنمائی ہوتی ہے کہ قوانین واحکام کی اصلی روح کو محفوظ کردینے کے بعد قرآن میں جزئیات کی تشریح وتفریع میں اجمال اور سکوت کی راہ جو عموماً اختیار کی گئی ہے حتیٰ کہ نماز اوقاتِ نماز تک کی یہ حالت ہے کہ اس کی اصلی روح

وما امروا الا لیعبدوا اللہ اور نہیں ذمہ دار ٹھیرائے گئے ہیں لیکن صرف اسی بات کے

مخلصین لہ الدین کہ پوجے جائیں اللہ کو، دین کو اسی کیلئے خالص کرتے ہوئے

یا نماز کا اصل مقصد

اقم الصلوٰۃ لذکری کھڑی کرو نماز کو میری یاد کے لئے۔

نمازیوں سے جس چیز کا حقیقی مطالبہ ہے اسے

الخاشعین الذین یظنون خشوع طاری کرنے والے اپنے آپ پر دھیان جماتے ہیں اس

انھم ملاقوا ربھم بات کا، کہ اپنے رب سے وہ ملاقات کر رہے ہیں۔

وغیرہ آیتوں میں محفوظ کرکے نماز کے ظاہری عناصر واجزا مثلاً قیام ورکوع، سجود، قرارۃ وغیرہ کا ذکر کچھ ایسے طریقہ سے مختلف مقامات میں مختلف حیثیتوں سے کیا گیا ہے کہ نماز اور اس کے اجزا کی باہمی ترتیب کی جو موجودہ شکل وصورت ہے، قرآن سے اس کے نکالنے کی کوشش

(بقیہ حاشیہ ص ۲۲۶) آپ نے فرمایا کہ "فصلیکم بالصلوٰۃ فی بیوتکم" یعنی اس نماز کو تم لوگ گھر میں پڑھ لیا کرو جس کا مطلب یہی ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں تراویح کی جو نماز چند دن پڑھی گئی اس سے لوگوں کو روک دیا گیا، یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ تیرہ سو سال تک مسلمان جس نماز سے نبوی فرمان کی تعمیل میں رکے ہوئے تھے، اسی ممنوعہ نماز کو اس زمانہ میں بنام تراویح پڑھنے کی کیوں کوشش کی جارہی ہے، عام مسلمان تراویح کے نام سے جو نماز رمضان میں پڑھتے ہیں وہ یہ سمجھ کر پڑھتے ہیں کہ یہ عہد نبوت کی نماز نہیں ہے بلکہ خلفاء راشدین کی قائم کردہ سنتوں میں سے ایک سنت ہے یعنی حضرت عمرؓ نے اپنے عہد میں اس کو قائم فرمایا چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خلفاء راشدین کی سنت کو بھی سنت ہی فرمایا ہے اس لئے عمری تراویح پر بھی سنت کے لفظ کا اطلاق کیا جاتا ہے اس سے تراویح کی رکعتوں کا مسئلہ طے ہوجاتا ہے یعنی آٹھ رکعت والی تراویح عہد نبوت کی تو بحکم نبوی ممنوع ہوچکی تھی، اس آٹھ رکعت کو پھر پڑھنا ارشادِ نبوی کی خلاف ورزی ہے۔ باقی بیس رکعت والی تراویح یہ حضرت عمرؓ والی تراویح ہے اور یہ بیس رکعت ہی کے ساتھ ادا ہوتی ہے۔

ظاہر ہے ایک بے سود اور لاحاصل کوشش ہوگی۔

اور یہ قصہ کچھ ایک نماز ہی کا نہیں ہے، اسلام کے ارکانِ مہمہ، زکوٰۃ، صوم، حج وغیرہ وغیرہ کی جو تفصیلات ہیں، کیا کسی کے بس میں ہے کہ مجرد قرآنی آیات سے ان کو نکال کر دکھائے حضرت عمران بن حصین صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسی قسم کی توقع رکھنے والے ایک آدمی کو مخاطب فرماتے ہوئے کہا تھا۔

انك امرؤ احمق اتجد فی	تم تو ایک بیوقوف آدمی ہو کیا کتاب اللہ میں تم یہ پاسکتے
کتاب اللہ الظھر اربعاً ولا	ہو کہ نماز ظہر کی رکعتوں کی تعداد چار ہے اور یہ کہ اس میں
یجھر فیھا بالقراۃ [1]	قرأۃ جہر (آواز) کے ساتھ نہ ہونا چاہئے۔

حضرت عمرانؓ زکوٰۃ اور اسی قسم کے چند دوسرے اسلامی ارکان کے نام لے لیکر اس شخص سے پوچھتے جاتے تھے۔

اتجد ھذا فی کتاب اللہ مفسرا	کیا کتاب اللہ میں اسے تم مفسر اور مفصل حال میں پاسکتے ہو

آخر میں آپ نے فہمائش فرماتے ہوئے کہا

ان کتاب اللہ اجمل ھذا	کتاب اللہ نے ان چیزوں کو مبہم اور مجمل شکل میں بیان کیا
وان السنۃ تفسر ذلك	ہے اور "سنت" نے ان کی تشریح و تفسیر کی ہے۔

قرآنی مطالبات میں اجمال و ابہام کا یہ رنگ کیوں اختیار کیا گیا؟ منجملہ دیگر وجوہ و مصالح کے جہاں تک میں خیال کرتا ہوں

یرید اللہ بکم الیسر ولا	چاہتا ہے اللہ تمہارے ساتھ آسانی، نہیں چاہتا
یرید بکم العسر	تمہارے لئے دشواری۔

اور اس جیسی مختلف آیتوں میں جس تیسیر اور نرمی کے عام رحیمانہ اور رؤفانہ دستور کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اگر اس کو بھی اس طرزِ عمل کے اختیار کرنے میں دخیل سمجھا جائے تو میرے

---

[1] الموافقات للشاطبی ج ۳ ص ۲۶۔

نزدیک اس کے انکار کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی، ورنہ ظاہر ہے کہ تفصیل و تفسیر کا ارادہ اگر قرآن میں کرلیا جاتا تو اس سے بہتر تفسیر و تفصیل اور کس کی ہوسکتی تھی۔

پیغمبر کی عام تبلیغ کی ایک خصوصیت

بہرحال قرآن میں یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے، اور قصداً اختیار کیا گیا ہے۔ بلکہ جہانتک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل سے معلوم ہوتا ہے، خصوصاً علمائے احناف کا اس باب میں جو خیال ہے اس بنیاد پر تو یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اپنی عام تبلیغ کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی قرآن کے اجمالی مطالبات کے صرف ان ہی تفصیلات و تشکیلات تک محدود رکھنے کی قصداً پوری کوشش کی ہے جن کا مسلمانوں کی زندگی سے عمومی و وجوبی تعلق تھا۔ یا علامہ ابوبکر جصاص[1] رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ ہیں۔

ما یلزم الکافۃ ویکونون	عام مسلمانوں کے لئے جن کی تعمیل لازم تھی اور فرض
متعبدین فیہ بفرض لا یجوز	کی صورت میں جن کی بجاآوری ان کے لئے اس
لھم ترکہ ولا مخالفتہ	طریقہ سے ضروری تھی کہ جن کا نہ ترک کرنا جائز تھا
(ج ۱ ص ۳۰۲)	اور نہ اسکی مخالفت روا تھی۔

اپنی فقہی تفسیر میں علامہ نے اس بڑے اہم اسلامی "اساس" کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

کل ما بالناس حاجۃ عامۃ فلابد	جن شرعی امور کی ضرورت عام مسلمانوں کو ہے
ان یکون من النبی صلی اللہ	پیغمبر پر ضروری ہے کہ امت کو اس سے واقف
علیہ وسلم توقیف الامۃ علیہ	بنائیں۔

---

[1] علامہ ابوبکر جصاص جن کا اصلی نام احمد بن علی ہے فقہاء احناف کے ان بزرگوں میں ہیں جنھیں مجتہد فی المذہب کے لقب سے ملقب کیا گیا ہے۔ مولانا عبدالحی فرنگی محلی لکھا ہے کہ شمس الائمہ وغیرہ جن کا شمار مجتہدین فی المذہب کے سلسلہ میں کیا جاتا ہے۔ کلھم عیال علیہ یعنی الجصاص کے سب ہی منت شناس ہیں۔ دیکھو فوائد بہیہ ص ۱۶ مطبوعہ ہند، علامہ الجصاص کی ولادت ۳۰۵ھ میں اور وفات ۳۷۰ھ میں ہوئی۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ فقہ کے ساتھ علم حدیث میں بھی نمایاں قابلیت کے مالک تھے جس کی بڑی دلیل ان کی مشہور فقہی تفسیر ہے جو حال میں قسطنطنیہ میں شائع ہوئی ہے۔ ۱۲۔

وہ لکھتے ہیں کہ یہی وجہ ہے جس کی بنیاد پر

قال اصحابنا ما کان	ہمارے اصحاب (امام ابوحنیفہ، ابویوسف، محمد وغیرہ)
من احکام الشریعۃ	کا قول ہے کہ شریعت کے جن احکام کے جاننے کی عام
بالناس حاجۃ الی معرفتہ	لوگوں کو ضرورت ہو ان کے ثبوت کیلئے ضروری ہو کہ
فسبیل ثبوتہ الاستفاضۃ	وہ عام طور پر امت میں شائع وذائع ہوں اور ان
والخبر الموجب العلم	کی خبر ایسے قوی ذریعہ سے پہنچی ہو جس سے یقین
؏	پیدا ہو سکتا ہو۔

علامہ نے پھر بڑی تفصیل سے اس مسئلہ کو سمجھایا ہے ایک موقعہ پر اسی قسم کے چند شرعی احکام کا ذکر کر کے وہ فرماتے ہیں۔

لما کانت البلوی عامۃ من کافۃ الناس	یہ یا ان جیسی چیزوں میں چونکہ عام لوگوں کو مبتلا
بھذہ الامور ونظائرھا فغیر	ہونا پڑیگا، اور ہر ایک سے ان کا تعلق ہوگا تو عام
جائز ان یکون فیہ حکم اللہ تعالی	لوگوں کو ان سے واقف کرنا خدا کی طرف سے ضروری ہوا
من طریق التوقیف الا وقد	ایسی صورت میں اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ
بلغ النبی صلی اللہ علیہ وسلم	پیغمبر نے اس کی یقیناً تبلیغ کی، اور عام لوگوں
ذلک ووقف الکافۃ۔	(الکافہ) کو اُن سے واقف بنایا۔

اسی بنیاد پر وہ کہتے ہیں کہ جن چیزوں کو ان کی عمومیت کی وجہ سے پیغمبرؐ نے "الکافہ" اور عام لوگوں تک پہنچایا۔ تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ پیغمبر سے جو چیزیں الکافہ تک پہنچی ہوں، ان کے بیان کرنے والے بجائے الکافہ اور عام لوگوں کے اکے دکے صرف چند لوگ ہوں، علامہ فرماتے ہیں۔

غیر جائز علیھا ترک	ان عمومی مطالبات کے متعلق کسی طرح یہ بات جائز
النقل والاقتصار علی ما	نہیں ہو سکتی کہ لوگوں نے ان کی نقل وبیان کو چھوڑ دیا

یقلہ الواحد بعد	اور صرف اسی پر بھروسہ کر لیا ہو کہ ایک آدمی کے
الواحد۔ [1]	بعد ایک آدمی بھی اگر بیان کر دیگا تو وہ کافی ہوگا

علامہ نے ایک فقہی مثال سے بھی اس مسئلہ کو سمجھانا چاہا ہے بلکہ اسی مسئلہ کے ذیل میں انھوں نے حنفی مکتب خیال کے "اس اساسی قانون" کا تذکرہ فرمایا ہے۔

انھوں نے رویتِ ہلال کے مسئلہ کا ذکر کیا ہے، یعنی رمضان کے چاند کا لوگوں کو انتظار ہو، اور فرض کرو کہ ابر و غبار اور ہر قسم کی آلودگی سے مطلع صاف ہو، نگاہیں ٹکٹکی باندھے افق پر چاند کو تلاش کر رہی ہوں، تلاش کرنے والوں کی بینائیوں میں کسی قسم کا سقم اور خرابی بھی نہ ہو، ایسی صورت میں عام مجمع کے خلاف صرف ایک یا دو آدمی اگر دعوٰی کر بیٹھیں کہ میں نے چاند دیکھا ہے، تو ان کا یہ دعوٰی اور ان کی یہ خبر کیا درخور اعتنا اور قابلِ قبول ہو سکتی ہے؟ علامہ فرماتے ہیں۔

فغیر جائز ان یطلبہ ھھم	یہ کبھی ممکن نہیں ہو سکتا کہ ایک بڑا مجمع چاند کو ڈھونڈھ
الجمع الکثیر ولا علۃ بالسماء	رہا ہو اور آسمان میں کسی قسم کی علت (گرد و غبار،
مع توافی حرصھم علی	ابر وغیرہ) بھی نہیں ہے، ان ڈھونڈھنے والوں میں
رویتہ ثم یراہ النفر الیسیر	ہر ایک چاہ رہا ہے کہ چاند پر اس کی نظر پڑ جائے ہر ایک
منھم ولا یراہ الباقون	کو اسی کی لو لگی ہوئی ہو مگر باوجود اس کے صرف چند کے
مع صحۃ ابصارھم	دکے آدمی تو چاند کو دیکھ لیں اور اپنی بینائیوں کی صحت
وارتفاع الموانع عنھم	وسلامتی کے ساتھ دوسرے نہ دیکھ پائیں حالانکہ موانع
	(غبار و ابر وغیرہ) بھی موجود نہیں ہیں۔

پھر خود ہی جواب دیتے ہیں۔

فاذا اخبر بذلک النفر	پس یہ چند کے دکے چاند کے دیکھنے کے دعوے

---

[1] تفسیر ابی بکر جصاص ج ۱ ص ۲۰۳۔

الیسیر منهم دون — کرنے والے اگر چاند ہونے کی خبر کافہ یعنی عام
کافتهم علمنا انهم غالطون — مجمع کے مقابلہ میں دیں گے تو ہم یہی باور کرینگے کہ یہ
غیر مصیبین فاما ان — دیکھنے والے ہی غلطی پر ہیں اور جو خبر یہ دے رہے ہیں
یکون رؤا خیالا فظنوه — وہ صحیح نہیں ہے اب خواہ یہ ہوا ہو کہ ان لوگوں نے
هلالا اوتعمدوا الکذب — خیالی چاند کو واقعی چاند سمجھ لیا ہو، یا قصداً غلط
(ص ۲۰۲) — بیانی کر رہے ہوں۔

اور صرف علامہ جصاص ہی نے نہیں "تشریع اسلامی" کے اس مہتم بالشان اصول کی طرف حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی براہ راست خود ہی اپنی اس مشہور تصنیف "رسالہ" میں بھی اشارہ فرمایا ہے جو اصولِ فقہ کی دنیا میں سب سے پہلی کتاب ہے، گو کچھ طوالت تو ضرور ہوگی مگر میرے نزدیک چونکہ فقہیات کی تدوین کی یہ بڑی اہم بنیاد ہے، اس لئے امام کے بھی جستہ جستہ فقرے نقل کرتا ہوں۔

جو چیزیں مسلمانوں میں اس نام سے پائی جاتی ہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ پیش کی ہوئی ہیں، حضرت امام نے علم کے اس ذخیرے کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے ایک حصہ کی تعبیر ان الفاظ میں فرمائی ہے۔

ما نقلته عامة عن عامة — ایک وہ ہے جو عامہ سے عامہ تک منتقل ہوتا
(رسالہ ص ۱۲۷) — ہوا چلا آ رہا ہے۔

امام فرماتے ہیں۔

وهذا الصنف من العلم کله — علم کی اس قسم میں ایک تو وہ چیزیں مندرج ہیں
موجود نصا فی کتاب الله جل — جو صراحتہً اللہ کی کتاب میں پائی جاتی ہیں، اور
ثناؤه وموجودة عاما عند اهل الاسلام — دوسری وہ ہیں جو مذہب اسلام میں اس طور پر پائی جاتی
وینقله عوامهم عن من مضی عن — ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرتے

عوامھم یحکونہ عن رسول اللہ ہوئے عامۃ المسلمین انھیں ان عام مسلمانوں سے نقل کرتے
صلی اللہ علیہ وسلم (ص ۱۲۷) ہوئے چلے آرہے ہیں جو ان سے پہلے گذرے ہیں۔

گویا امام کے نزدیک قرآنی مطالبات کے ساتھ وہ ساری چیزیں اسی صنف میں داخل ہیں، جنھیں ایک نسل سے دوسری نسل تک ایک طبقہ سے دوسرے طبقہ تک آنحضرتؐ کی طرف منسوب کرتے ہوئے مسلمان اس طریقہ سے بغیر کسی ادنیٰ وقفہ اور ایک لمحہ کے انقطاع کے منتقل کرتے ہوئے چلے آرہے ہیں۔ جیسے قرآن ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتا ہوا پہنچا ہے کہ مسلم ہی نہیں ایک غیر مسلم کے لئے بھی خدا کی طرف قرآن کا انتساب یہ تو محل بحث و نظر ہوسکتا ہے، لیکن یہ وہی کتاب ہے جسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کی طرف سے دنیا میں پیش کیا ہے، اس کا انکار ان تمام قطعیات کا انکار بن جاتا ہے جن کے ماننے پر تواتر و توافق کا قانون انسانی فطرت کو مضطر اور بے بس کئے ہوئے ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف قرآن کا انتساب جس بنیاد پر قطعی اور یقینی ہے، بجنسہٖ یہی حال ان تمام شرعی حقائق کا ہے جو علم و یقین کی اسی راہ سے مسلمانوں تک پہنچے ہیں۔ امام کے الفاظ میں ان کا علم بھی

علم عامۃ مما یسع بالغا غیر مغلوب علیٰ عقلہ بجھلہ۔ ایک ایسے عام علم کی حیثیت و نوعیت رکھتا ہے کہ ایک عاقل بالغ جس کی عقل جنون کے نیچے دبی نہ ہو وہ ان سے جاہل نہیں رہ سکتا۔

پھر بطور مثال کے امام نے سمجھاتے ہوئے لکھا ہے۔

مثل ان الصلوٰۃ خمس وان علی الناس صوم رمضان و حج البیت ان استطاعوا وزکوٰۃ فی اموالھم واند حرم علیھم مثلاً یہ بات کہ نماز پانچ وقتوں کی فرض ہے، لوگوں پر رمضان کے روزے فرض ہیں۔ بیت اللہ کا حج بشرط استطاعت فرض ہے ان کے اموال میں زکوٰۃ فرض ہے، سود، چوری، زنا، شراب

الربوا والسرقة والزناء والخمر — یہ چیزیں ان پر حرام ہیں، اور جو بھی
وکان فی معنی ھذا [1] — ایسی چیزیں ہوں۔

ظاہر ہے کہ یہ سب ایسی چیزیں ہیں، جن کا ذکر یا تو قرآن میں صراحۃً پایا جاتا ہے یا قطعیت کی جس راہ سے قرآن کا علم اگلی نسلوں سے منتقل ہو کر پچھلی نسلوں تک پہنچا ہے، اسی راہ سے جو چیزیں ہم تک پہنچی ہیں یعنی وہی "ما نقلہ عامۃ عن عامۃ" کی راہ ان کی بھی ہے، اور بحمداللہ یہ حال ان تمام شرعی مطالبات کا ہے جن کا تعلق عام مسلمانوں کی زندگی کے ساتھ وجوب ولزوم کا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کے بعد جن شرعی مطالبات کی تعمیل عام مسلمانوں کے لئے ضروری اور ناگزیر تھی، پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تبلیغ عام کو چونکہ ان ہی کی حد تک محدود رکھا یہی وجہ ہوئی کہ جو چیزیں ایسی نہ تھیں جہاں تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل سے معلوم ہوتا ہے زیادہ تر یا تو ان سے خاموشی ہی اختیار فرمائی گئی یا کسی وجہ سے اگر ان کے متعلق کچھ فرمایا بھی گیا ہے تو اس طریقہ سے کہ مسلمانوں میں وہ الجصاص کے الفاظ میں۔

ما ینقلہ الواحد بعد واحد — جسے ایک کے بعد ایک نے بیان کیا ہو،

کی شکل میں منتقل ہوئیں، یا امام شافعی نے جس کی تعبیر ان الفاظ میں فرمائی ہے یعنی

خبر الواحد عن الواحد حتی ینتھی — ایک کی خبر ایک سے تاآنکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم
الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم [2] — تک پہنچ جائے۔

ان بزرگوں کا اشارہ دراصل دین کے اس ذخیرے کی طرف ہے، جن کے ثبوت کا ذریعہ بجز ان حدیثوں کے جنھیں اصطلاحاً خبر احاد کہتے ہیں اور کچھ نہیں ہے، مطلب یہ ہے کہ ان کے ساتھ بھی اگر تبلیغ عام کا طریقہ اختیار کر کے ان میں بھی استفاضہ اور عمومیت کی وہی کیفیت پیدا کر دی جاتی جو ان چیزوں کا حال ہے جن کی تعمیل ہر مسلمان کے لئے عام حالات میں ناگزیر ہے

---

[1] رسالہ ص ۹۶۔ [2] رسالہ ص ۲۲۵۔

تو پھر ان کے مطالبہ کا رنگ بھی وہی شدت اختیار کر لیتا اور شارع علیہ السلام کا یہ مقصود نہ تھا

الجصاص لکھتے ہیں کہ خبر احاد ہونا ان کا، یہی دلیل اس بات کی ہے کہ

فیهم مخیرون فی ان	مسلمانوں کو ان امور کے متعلق اختیار ہے کہ جو چاہیں
یفعلوا ماشاوا وانما الخلاف	کریں (یعنی ترک وفعل کا اختیار ہے) فقہا میں ان کے
بین الفقهاء فیه فی الافضل	متعلق اختلاف جو کچھ ہے وہ افضلیت میں ہے
منه (ص ۲۰۴)	یعنی کرنا افضل ہے یا نہ کرنا۔

الجصاص ان چیزوں کو چند شرعی مثالوں سے سمجھاتے ہوئے کہتے ہیں۔

وهذا سبیل ماذکرت من امر	یہ حال ان چیزوں کا ہے جن کا میں نے ذکر کیا
الاذان والاقامة وتکبیر	یعنی اذان اقامت (کے الفاظ کی تعداد کا جو مسئلہ ہے)
العیدین والتشریق ونحوها	یا عیدین وتشریق کی تکبیروں کا جو حال ہے
من الامور التی نحن مخیرون	کہ یہ ایسے امور ہیں جن میں ہمیں اختیار
فیها۔	بخشا گیا ہے۔

پھر اس شبہ کے ازالہ کے لئے کہ جب مسلمانوں کو اختیار دیا گیا ہے تو ان ہی امور کے متعلق فقہا میں اختلاف کیوں پایا جاتا ہے اگرچہ پہلے بھی جواب کی طرف اشارہ کر چکے ہیں، لیکن دہرا کر پھر فرماتے ہیں۔

انما الخلاف بین الفقهاء	فقہا کا اختلاف ان امور میں صرف اس حد تک
فی الافضل منها۔	ہے کہ افضل اور بہتر کیا ہے۔

علامہ نے اس کے بعد لکھا ہے۔

فلذلك جاز ورود بعض الاخبار	یعنی ان امور کی خصوصیت ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ بعض
فیه من طریق الاحاد۔	خبروں کا بطریق احاد وارد ہونا جائز ہوا۔

کیونکہ بالفاظ جصاص

لیس علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم	جن چیزوں میں مسلمانوں کو اس قسم کا اختیار دیا گیا ہو،
توقیفھم علی الافضل مما	ان میں افضل اور بہتر کیا ہے، ان سے الکافہ (یعنی
خیرھم فیہ۔	عامۃ الناس) کو مطلع کرنا پیغمبر کے لئے ضروری نہیں ہے

پھر آحاد ذرائع سے جو حدیثیں مروی ہیں ان میں کبھی کبھی جو اختلاف پایا جاتا ہے مثلاً رکوع سے اٹھنے اور رکوع میں جانے کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ اٹھانے کا مسئلہ ہے جسے رفع الیدین کہتے ہیں، ان ہی احاد خبروں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو ہاتھ اٹھاتے دیکھا گیا اور بعضوں سے ثابت ہوتا ہے کہ نہیں دیکھا گیا۔ اسی طرح بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آمین زور سے کہی جاتی تھی، بعضوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آہستہ سے — جصاص ان کے متعلق اپنا خیال یہ ظاہر کرتے ہیں کہ

یحمل الامر علی ان النبی	یعنی یہ سمجھا جائیگا کہ ان میں ہر دو پہلو کا مسلمانوں
صلی اللہ علیہ وسلم قد کان	کو اختیار ہے، اسی کو بتانے اور اسی کی تعلیم
منہ جمیع ذلک تعلیما منہ	دینے کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سب
وجہ التخییر۔	باتیں وقوع پذیر ہوئی ہیں۔

حضرت امام شافعیؒ نے بھی اس قسم کی چیزوں کے متعلق رسالہ میں اس کی تصریح کی ہے کہ عوام میں ان کا شائع اور مستفیض ہونا ضروری نہیں بلکہ

علم الخاصۃ من خبر	یعنی خاص آدمی کی خبر چونکہ ہوتی ہے اس لئے ان کا
الخاصۃ یعرفہا العلماء	علم بھی خاصہ ہی تک محدود رہتا ہے، یہی وجہ ہے
(ص ۱۲۷)	ان کو علم والے ہی جانتے ہیں۔

گویا حاصل یہ ہوا کہ شریعتِ اسلامی کے وہ سارے عناصر و اجزا جن کی عامۃ الناس کو حاجت تھی، پیغمبر نے ان کی تبلیغ ہی اس شان کے ساتھ کی اور اسی شان سے کرنا بھی چاہیئے تھا، کہ عام مسلمانوں میں وہ شائع و ذائع ہو گئے۔ اور پہلی نسلوں نے پچھلی نسلوں تک ان کو

اس طرح پہنچا دیا کہ قریب قریب ان کی حیثیت ان امور کی ہوگئی ہے جن میں تواتر کی وجہ سے شک وشبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں ہے، تقریباً اور دین کی ایسی ساری چیزیں جن پر مسلمانوں کا اتفاق ہے ان کا یہی حال ہے، اسی لئے میں کہتا ہوں کہ قرآن ہی نہیں بلکہ قرآن کے سوا بھی جو چیزیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہیں ان کا ایک بڑا عظیم حصہ متواتر ہے۔

ایک نماز ہی کو لے لیجئے، قرآن میں تو صرف اقیموا الصلوٰۃ کا مطالبہ کیا گیا ہے لیکن جیسا کہ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا نماز ظہر کی رکعتوں کا چار یا مغرب کی تین، صبح کی دو ہونا، یا ہر رکعت میں ایک رکوع اور دو سجدوں کا ہونا، یا ازیں قبیل نماز کے وہ سارے اجزار جن پر مسلمانوں کا اتفاق ہے، یہ ہم تک جو منتقل ہوئیں تو اسی طریقہ سے ہوئی ہیں کہ لاکھ ڈیڑھ لاکھ صحابہ دن میں پانچ دفعہ ان پر عمل کرتے تھے، ان سے نماز کی یہی شکل ان کے بعد والی نسل تک پہنچی اور ان سے ان کے بعد والوں تک تا اینکہ پہلی صدی ہجری میں زمین کے باشندوں کی کروڑہا کروڑ تعداد رکھنے والی ایک قوم کا وہ اجتماعی عمل بن گیا اور نسلاً بعد نسلٍ وہی اجتماعی عمل مسلمانوں میں منتقل ہوتا ہوا چلا آرہا ہے۔ اور یہی حال ان عام اعمال وافعال کا ہے جن کا جصاص کے الفاظ میں "کافۃ الناس" سے اور امام شافعیؒ کے الفاظ میں "العامۃ" سے تعلق ہے یہی بنیاد ہے اس دعویٰ کی کہ قرآن کے بعد حدیث کا وہ سارا ذخیرہ جس کا تعلق ان ہی کافۃ الناس والے امور سے ہے، ان کی حیثیت گویا متواتر کی ہے اور میں نہیں جانتا کہ بجز ان لوگوں کے جو بقول امام شافعیؒ مغلوب العقل ہوں کوئی اس دعویٰ کی صداقت میں مذبذب ہو سکتا ہے۔

لیکن اسی کے مقابلہ میں دین کے جن مطالبات کی یہ کیفیت نہ تھی وہ اگر ہم تک آحاد خبروں، یا الواحد عن الواحد کی راہ سے پہنچے ہیں تو ان کے متعلق یہ خیال کرنا کہ یہ کسی اتفاقی حادثہ کا نتیجہ ہے صحیح نہ ہوگا۔ بلکہ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خود ہی ان کے متعلق کچھ ایسا طرز عمل اختیار فرمایا کہ ان میں استفاضہ وشہرت وشیوع کی وہ کیفیت پیدا نہ ہو سکی۔ پس خبر احاد کی شکل میں ان کا منتقل ہونا، یہ واقعہ ہوا نہیں ہے بلکہ کیا گیا ہے اور قصداً کیا گیا ہے۔ نبوت کی دور رس

نگاہ سے یہ رازا وجھل نہیں رہ سکتا تھا کہ عہدِ نبوت میں ان کے ساتھ اگر یہ طرزِ عمل اختیار نہ کیا جائے گا تو ان میں بھی وہی رنگ بالآخر پیدا ہو جائے گا جو ضروریاتِ دین کے مطالبہ کا رنگ ہے تراویح کی نماز کی مثال گذر چکی یعنی اسی اندیشہ سے کہ مسلمانوں میں وجوب اور فرضیت کا رنگ کہیں یہ نماز نہ اختیار کرلے آپ نے ترک فرمادیا۔ اور یہ تو فعلی مثال تھی، پیغمبر کی نظر (صلوات اللہ علیہ و سلامہ) دین کے ان دقائق پر کس حد تک رہتی تھی اس کا اندازہ اس قولی حدیث سے بھی ہو سکتا ہے جو حج کے متعلق صحاح کی کتابوں میں پائی جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن میں حج کے مطالبہ والی آیت للہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلا (لوگوں پر اللہ کے گھر کا حج واجب ہے جو راہ کی استطاعت رکھے) نازل ہوئی، تو ایک صحابی نے حسب دستور قرآنی مطالبات کے اجمالی رنگ کو پیش نظر رکھکر چاہا کہ پیغمبر سے اس کی تفصیل پوچھی جائے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ وہ صاحب اٹھے اور آنحضرت کو خطاب کرکے دریافت کیا۔

افی کل عام	کیا یہ حج مسلمانوں پر ہر سال فرض کیا گیا ہے
یارسول اللہ ؐ	اے اللہ کے رسول ؐ

قرآنی مطالبات کا اجمالی ہونا یہ تو درست تھا لیکن اسی کے ساتھ دوسرا نکتہ جو یہ تھا کہ جس اجمال کی تفصیل عام مسلمانوں کے لئے ضروری ہوتی تھی جیسا کہ جصاص نے لکھا ہے پیغمبر پر تو خود ہی اس کی عام تبلیغ واجب تھی اور یہ کہ جن تفصیلات کی نوعیت یہ نہ تھی، عموماً پیغمبر اس سے خاموشی اختیار فرماتے تھے۔ بس یہی نکتہ تھا جو پوچھنے والے صحابی کے سامنے اس وقت تھا روایت ہے کہ سوال کے بعد بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا کہ خاموشی اور سکوت ہی کی راہ سے تشریع کا جو طریقہ ہے وہ انھیں سمجھا دیا جائے اس لئے باوجود ان کے دریافت کرنے کے آپ خاموش ہی رہے۔ حدیث میں ہے

فسکت (یعنی اس سوال پر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چپ ہی رہے)

مگر خدا جانے ان صحابی پر اس وقت کیا حال طاری تھا کہ آپ کی خاموشی سے بھی ان کو تنبیہ

نہ ہوئی، اور دوبارہ بھی انھوں نے اپنے سوال کو دہرایا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اب بھی خاموش ہی رہے مگر بات ان کے پھر بھی سمجھ میں نہ آئی اور تیسری دفعہ بھی

افی کل عام — کیا یہ حج مسلمانوں پر ہر سال فرض کیا گیا ہے

یارسول اللہ — اے اللہ کے رسولؐ۔

وہ کہہ رہے تھے جب سوال کی نوبت اس حد کو پہنچ گئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اندازہ فرمالیا کہ اب خود ان کی سمجھ میں یہ بات نہ آئیگی تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مخاطب فرماتے ہوئے پہلے تو "لا" یعنی "نہیں" کے ذریعہ سے جواب دیا جیسا کہ ترمذی میں ہے۔

قال لا — یعنی جواب میں ارشاد ہوا کہ نہیں ہر سال فرض نہیں ہے بلکہ عمر بھر میں ان مسلمانوں پر جو زاد راہ کی استطاعت رکھتے ہوں ایک دفعہ فرض ہے۔ اس کے بعد مطالباتِ شرعیہ کی تبلیغ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جو طرزِ عمل تھا، اس کی تشریح ان ان الفاظ میں فرماتے ہوئے ان کو سمجھانا شروع کیا۔

ذرونی ما ترکتم — چھوڑ دیا کرو مجھے اس چیز میں جسے چھوڑ دیا کروں میں تم لوگوں کے لئے۔ (مسلم)

جس کا وہی مطلب ہے جس کی طرف علامہ جصاص اور حضرت امام شافعیؒ نے اشارہ فرمایا تھا کہ جن مطالبات کی نوعیت ضرورت و وجوب کی ہے انھیں تو میں خود ہی پہنچانے پر آیتِ قرآنی

یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیك فان لم تفعل فما بلغت رسالتك۔ — اے پیغمبر پہنچا دیا کرو، ان چیزوں کو جو تم پر نازل کی گئی ہیں، اگر ایسا نہیں کروگے تو تم نے اپنے پیغام کو نہیں پہنچایا۔

کے فرمانِ الٰہی سے خود ہی مامور ہوں۔ خواہ ان کا نزول وحی جلی (قرآن) کے ذریعہ سے ہو، یا قرآن کے اجمالی مطالبات کی جو تفصیلات آپ کو خدا کی طرف سے دوسرے ذرائع سے

بتائے جاتے ہوں وہ ہوں[۵۱]۔ اور جن امور کے متعلق یہ طریقہ اختیار نہیں کرتا بلکہ "چھوڑ دیتا ہوں" تو تم لوگ خواہ مخواہ پوچھ پوچھ کر اس اجمال کے کسی خاص پہلو کو متعین کرانے کی کوشش نہ کیا کرو، آپ نے بطور تمثیل کے اس کے بعد سمجھایا کہ اگر میں تمہارے سوال کے جواب میں بجائے "نہیں" کے "ہاں" کہدیتا تو بلاوجہ ایک ایسی بات جس میں مسلمانوں کو اختیار حاصل تھا اس میں مقید ہوجاتے، حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا

لوقلت نعم لوجبت	اگر میں ہاں کہدیتا تو پھر وہی واجب ہوجاتا یعنی
(مسلم)	ہر سال مسلمانوں پر حج فرض ہوجاتا۔

یعنی وہی بات جس کی طرف ابن عباسؓ نے بنی اسرائیل کے قصہ ذبح بقرہ میں اشارہ کیا ہے،

ان بنی اسرائیل لو	اگر بنی اسرائیل کسی معمولی ادنیٰ درجہ کی گائے کو
اخذوا ادنیٰ بقرۃ	پکڑ لاتے (اور ذبح کردیتے) تو ان کی طرف
لاجزءت عنھم[۵۲]	سے کافی ہوجاتا۔

مطلب یہ ہے کہ ذبح گاؤ کا جو مطالبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حق تعالیٰ کی طرف سے بنی اسرائیل پر پیش کیا تھا، اگر بنی اسرائیل سوال کرکر کے جواب میں قیود کا اضافہ نہ کراتے جاتے اور کوئی سی بھی گائے لاکر ذبح کردیتے تو خدا کا مطالبہ پورا ہوجاتا لیکن جس چیز میں ان کو اختیار تھا خواہ مخواہ پوچھ گچھ کے قصہ کو بڑھا کر اپنے لئے انھوں نے خود تنگی پیدا کرلی۔

بہرحال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حج والے قصہ میں بھی اس کی وجہ بتلاتے ہوئے

---

۵۱ مثلاً جبریل امینؑ نے آکر آپ کو نماز اور وقت نماز وغیرہ باتیں بتائیں، کبھی یہ ہوتا تھا، کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک میں اس علم کا الہام ہوتا تھا جس کی تعبیر نفث فی روعی (میرے دل میں پھونکا گیا) سے فرماتے تھے، علماء کا یہ بھی خیال ہے کہ مشکوٰۃ نبوت کی روشنی میں بھی بعض مجملات کی تفصیلات آپ پر واضح ہوجاتی تھیں۔ بہرحال جو کچھ بھی تھا "ان ھوالا وحی یوحی" ہی تھا (یعنی نہیں ہے وہ مگر جو آپ پر وحی کی جاتی ہے)۔ ۵۲ مجمع الفوائد ج ۲ ص ۷۲۔

کہ جن مطالبات میں ضرورت اور شدت کا رنگ نہیں ہوتا جن کا پہنچانا منصب نبوت کے لحاظ سے پیغمبر کے ضروری اور ناگزیر فرائض میں نہیں ہے۔ مثلاً یہی بات کہ ہر سال کسی مسلمان کو اگر حج کی توفیق ہو تو ظاہر ہے کہ ایک ایسے کام کی اُسے توفیق بخشی گئی، جس کی فضیلتوں اور رفعتوں کا کون اندازہ کر سکتا ہے، مگر باوجود ان فضیلتوں کے ہر سال حج کرنا چوں کہ فرض نہ تھا اس لئے بجائے تبلیغ عام کے سکوت اور ترک کا طریقہ کیوں اختیار کیا گیا، اسی حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا۔

لو قلت نعم لوجبت ولما	اگر میں ہاں کہدیتا تو وہ واجب ہوجاتا اور تم
استطعتم وانما اهلك	پھر اسے سنبھال نہ سکتے، جو لوگ تم سے پہلے تباہ
من كان قبلكم كثرة	ہوئے وہ سوالوں کی کثرت ہی سے تباہ ہوئے
سوالهم واختلافهم على	اور اس لئے تباہ ہوئے کہ اپنے پیغمبروں کے
انبيائهم۔	متعلق مختلف ہونے لگے۔

مقصد مبارک یہی تھا کہ امت کی سہولت اور حتی الوسع ان کے لئے ممکنہ گنجائش پیدا کرنا، میری اس خاموشی کا یہی سبب ہوتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے فضائل کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حتی الوسع ترک ہی کا طریقہ اختیار فرمانا چاہتے تھے۔

لیکن اگر بالکلیہ خاموشی ہی اختیار کرلی جاتی تو جو لوگ ان فضائل کو حاصل کرنا چاہتے تھے ان کو عمل پر ابھارنے والی کوئی چیز نہیں رہتی۔ یہی راز ہے کہ عام تبلیغ کے لحاظ سے سکوت اختیار کرتے ہوئے خصوصی طور پر بعض لوگوں کو ان کے فضائل پر بھی مطلع کردیا جاتا تھا، یہی حج ہے جس کے متعلق عام طریقہ بیان تو یہ تھا، لیکن جن صحابہ نے ایک سے زیادہ دفعہ حج کیا اور ان میں مشکل ہی سے کوئی ہوگا جو اس فضیلت سے محروم ہو، حتی کہ حسنین علیہما السلام کے متعلق تو سب ہی جانتے ہیں کہ کوتل سواریوں کو ساتھ رکھنے کے باوجود ان نبی زادوں نے پچیس پچیس حج کئے صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے بخاری وغیرہ میں نفلی حج کے فضائل کی جو حدیث مروی ہے

اس کے آخر میں یہ بھی ہے کہ

فلا ادع الحج لله اذ سمعت هذا من رسول الله صلى الله عليه وسلم [۱]	پس نہ چھوڑا میں نے حج کو جب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات سنی۔

ظاہر ہے کہ یہ اثر ان ہی حدیثوں کا ہے جو عام نہیں بلکہ تبلیغِ خاص کی راہ سے صحابہ میں پہنچی تھیں حتیٰ کہ اس سلسلہ میں تو بعض صحابہ کے متعلق یہاں تک بیان کیا جاتا ہے مثلاً حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ وہ کہتے تھے مجھ سے رسول اللہ نے فرمایا ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

ان عبدا اذا اصححت بدنه	ایک بندہ جس کے بدن کو میں نے چاق و تندرست
واوسعت عليه في الرزق	رکھا اور روزی میں اس کے وسعت عطا کی،
ولم يفد على في كل اربعة	باوجود اس کے ہر چار سال بعد وہ میرے یہاں
اعوام المحروم ۔ [۲]	نہ آیا تو ایسا آدمی محروم ہے۔

یعنی مواقع رکھتے ہوئے زندگی کی ایک بڑی قیمت سے محروم رہا، اور سچی بات بھی یہی ہے کہ معمولی دنیاوی بادشاہوں کی ڈیوڑھیوں میں کسی کو باریابی کا موقعہ اگر مل جاتا ہے تو حتی الوسع حاضر باش ہونے کی کوشش سے نہیں تھکتا، اگر کسی دن ناغہ ہو جاتا ہے تو اسے اپنی بڑی محرومی سمجھتا ہے بلکہ حج میں تو بات کچھ اس سے بھی آگے بڑھی ہوئی ہے کہ حکومت سے زیادہ محبت و عشق کی جلوہ نمائیوں کا حصہ اس عبادت میں زیادہ ہے، کون عاشق ہوگا جو محبوب کے در کی رسائی کے امکان کو پاتے ہوئے قصداً محروم بنے گا۔

خیر یہ تو الگ بات ہے، میں یہ کہہ رہا تھا کہ جس عمل میں حسنات، رفع درجات کی یہ کیفیتیں پوشیدہ ہیں، اس کے متعلق بھی جب تبلیغ عام کو نہ پسند فرمایا گیا بلکہ وہ راہ اختیار کی گئی جس کی وجہ سے بجائے استفاضہ اور شیوع عام کے اس کی حیثیت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ میں

---

[۱] مجمع الفوائد ج ۱ ص ۱۶۲ ۔ [۲] ایضاً ص ۱۶۴ ۔

خبر الواحد عن الواحد حتی ینتھی الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ ایک کی خبر ایک سے تا اینکہ اسی طریقہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک وہ خبر پہنچے۔

کی ہوگئی، آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ کسی اتفاقی حادثہ کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ سمجھ بوجھ کر انسانی فطرت کے ساتھ پیغمبر کے اقوال و اعمال کا جو تعلق ہے، اور جسے قدرتاً ہونا ہی چاہئے۔ اسی کو پیش نظر رکھکر قصداً و عمداً یہ طریقہ اختیار کیا گیا، تبلیغ عام کی صورت میں اندیشہ تھا کہ جس گنجائش کو ان امور میں شریعت قصداً باقی رکھنا چاہتی ہے کہیں آگے چل کر تنگی کی شکل نہ اختیار کرلے۔

لیکن یہ رعایتیں تو ہم جیسے عوام کے لئے تھیں جن کے لئے آج ان وجوبی مطالبات سے بھی عہدہ برا ہونا دشوار ہو رہا ہے، جن کے وجوب و فرضیت میں شک و شبہ کی قطعاً کسی حیثیت سے کوئی گنجائش نہیں ہے، ہر سال والے کو تو جانے دیجئے، عمر بھر میں ایک دفعہ جو حج فرض ہے اپنے دل پر ہاتھ رکھکر فیصلہ کرنے والے فیصلہ کرسکتے ہیں کہ استطاعت کے انتہائی مرتبہ پر رہنے کے باوجود کتنے سال گذرے اور گذر رہے ہیں جن میں بہتوں کے دل میں تو ادائی فرض کا کوئی خطرہ بھی نہیں گذرا ہے اور جن کے اندر احساسِ فرض کے جذبہ میں کبھی حرکت بھی ہوتی ہے تو کتنے حیلے اور بہانے اٹھ اٹھ کر اسے سکون سے بدل دیتے ہیں تہیل و تسویف کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے جو جاری ہے۔

لیکن ہم کوتاہ نصیبوں کے ساتھ ساتھ آخر آدم ہی کی اولاد میں بیدار بختوں اور بلند نگاہوں کا وہ طبقہ بھی تو ہے جو پیغمبر کی ہر ادا پر قربان اور ان کے ادنیٰ ادنیٰ اشاروں کا نگہبان بنا ہوا ہے آواز آئی کان میں کہ میرے محبوب نبی کا یہ منشا رمبارک تھا، اس سے بحث نہیں کہ فرض ہے یا واجب، سنت ہے یا مستحب، اولیٰ ہے یا افضل، تواتر کی راہ سے یہ بات پہنچی ہے یا شہرت و استفاضہ کے طریقہ سے، خبر احاد ہے یا مشہور، بہرحال اس کی تعمیل ہی کو مقصدِ حیات بنائے ہوئے ہیں جو کچھ مل سکتا ہے اسے کیوں چھوڑا جائے "دین" میں یہی ان کا حال ہے جیسے ابناء الدنیا میں وہی اقبال مند سمجھے جاتے ہیں جنھوں نے جو کچھ مل سکتا تھا، جس راہ سے

بھی مل سکتا تھا اس کے حاصل کرنے میں سستی اور کاہلی سے کام نہ لیا ہو۔

امت ہی کے آخر یہ بھی افراد تھے، ان کا خیال بھی ضروری تھا، یہ ان ہی کی خاطر منظور تھی کہ تبلیغ عام کی راہ کی پوری نگرانی کرتے ہوئے کسی نہ کسی طرح ان چیزوں کو بھی پیغمبر نے آخر پہنچا ہی دیا، جن کے ترک کرنے والے تو مواخذہ کے دائرہ سے نکل جاتے ہیں لیکن جو ان سے نفع اٹھانا چاہتے ہیں وہ بھی محرومی سے محفوظ ہو گئے۔ یعنی خبر الخاصہ عن الخاصہ امام شافعیؒ کے الفاظ میں یا الواحد بعد الواحد حصاص کے الفاظ میں، یا عام اصطلاح میں جسے خبر آحاد کی راہ کہتے ہیں۔ یہ چیزیں بھی امت تک بہر حال پہنچ ہی گئیں۔

(باقی آئندہ)

اچھی کتابیں

ابن رُشد۔ موسیو رنیان۔ اسپین کا نامور فلسفی — جمہوریہ افلاطون۔ دنیا کے سب سے بڑے مفکر کے

جس کی تصانیف صدیوں یورپ کی درسگاہوں — شجرِ علم کا پختہ ثمر اور جماعات انسانی کے عروج

میں پڑھائی جاتی رہیں اس کے سوانح حیات اور — زوال کا مرقع 5/8/-

فلسفہ کی مفصل تشریح . . . . . 5/- — دستورِ نفسیات۔ پروفیسر ولیم جیمس 5/8/-

یورپ (۱۹۱۸-۱۹۳۹) مترجمہ شیر محمد اختر 3/- — آسان علمِ معاشیات۔ چوبے . . . 5/-

چمنستان۔ مولانا ظفر علیخاں کا تازہ مجموعہ کلام 5/- — علمِ تمدن۔ گورکھ ناتھ . . . 4/-

تاریخ عالم۔ ایچ۔ جی ویلز (جلد اول) 5/- — اسلامی تہذیب۔ پروفیسر بارٹولڈ 3/-

(مکمل با تصویر فہرست مفت طلب فرمائیں)

کنول بک کلب 125 ڈبی بازار لاہور